© rasailojaraid.com

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم

۲۲ر مارچ ۱۹۷۴ء کو حمید احمد خاں صاحب کا انتقال ہوگیا - انا للہ وانا الیہ راجعون

میں کئی مہینے پہلے اعصابی درد کی شدت سے نڈھال بستر پہ پڑا تھا کہ ڈاکٹر ریاض الاسلام صاحب کا ٹیلیفون آیا - لیث صاحب، آپ نے پانچ بجے کی خبریں سنیں - میں ریڈیو بہت کم سنتا ہوں لیکن ریاض صاحب کے انداز سے دل دھک دھک کرنے لگا - یقیناً کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہے جس کی وہ مجھ سے تصدیق چاہتے تھے - میں نے کہا نہیں، خیر تو ہے - فرمانے لگے، شاید حمید احمد خاں صاحب کا انتقال ہوگیا "شاید" انھوں نے صرف اس لیے کہا تھا کہ میں اس خبر کے یکایک سننے کی شدت سے کچھ بچ جاؤں - میں نے ٹیلیفون رکھ دیا اور حمید احمد خاں صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا -

میری آخری ملاقات خاں صاحب سے لاہور میں نومبر ۱۹۷۳ء کے دوسرے ہفتہ میں ہوئی - میں اور میری بیوی ان سے ملنے ان کے مجلس ترقی ادب کے دفتر گئے - جیسے ہی میں کمرہ میں داخل ہوا انھوں نے حسبِ عادت دُور سے دیکھتے ہی السلام علیکم کہا اور مجھے گلے لگانے آگے بڑھے - یہ ان کی ہمیشہ سے عادت تھی اور جب وہ مجھے گلے لگاتے تو مجھے ایک ایسی تسکین ملتی جس کی مجھے ہمیشہ تلاش رہتی ہے - ان کے اس انداز میں قطعاً تکلف یا اہتمام نہیں ہوتا - بلکہ خلوص اور بےساختگی کا ایسا احساس ہوتا گویا حمید احمد خاں صرف ایک نامور ادیب، نقاد، استاد، دانشور، محب وطن اور اردو کے مجاہد ہی نہیں بلکہ ایک عظیم انسان ہیں اور ایسے موقعوں پر میرے ذہن میں کتنے ہی خاکے اُبھر آتے - میر محفوظ علی مرحوم، سبطین احمد صاحب مرحوم، علی گڑھ کے ڈاکٹر ایل - کے حیدر، ڈاکٹر ہادی حسن مرحوم، رشید احمد صدیقی، محمود حسین (قاری) مرحوم، اور پھر ۱۹۴۷ء کے بعد کے چہرے جن کو میں نے پاکستان میں آکر دیکھا - سر عبدالقادر، مولانا ظفر علی خاں، میاں بشیر احمد، خلیفہ عبدالحکیم، خلیفہ شجاع الدین، مولانا صلاح الدین -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میرا ذہن اس البم کی ورق گردانی میں گم ہو جاتا۔ یہ کیسے کیسے لوگ تھے۔ میں نے ان سے کیا کیا سیکھا اور کیا کیا پایا۔ ان میں سے کوئی بھی میرا عزیز یا رشتہ دار یا ہم وطن نہ تھا۔ (سوائے میر صاحب اور سبطین احمد صاحب مرحوم کے) لیکن میری یادوں میں سب سے زیادہ یہی نمایاں ہوتے اور ابھرتے ہیں۔ ان میں آج ایک اور چہرہ کا اضافہ ہو گیا۔ حمید احمد خاں کا چہرہ۔ حمید احمد خاں رخصت ہو گئے لیکن ان کا یہ چہرہ میرے ذہن کے پردے پر یوں ہی ثبت رہے گا جیسا ان کی زندگی میں تھا۔ میرے لیے حمید احمد خاں اب بھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

حمید احمد خاں صاحب کے بارے میں ان کے احباب، شاگردوں اور متعلقین کے جو تاثرات ہمارے سامنے ہیں ان سے حمید احمد خاں صاحب کی شخصیت بڑی پہلو دار نظر آتی ہے۔ ان کی مثال اس ترشے ہوئے ہیرے کی سی تھی جس کے ہزاروں پہلو ہوتے ہیں اور ہر پہلو سے روشنی کے سوتے اس طرح پھوٹتے نکلتے ہیں گویا وہی پہلو اس کی آب و تاب کا منبع ہو۔

خان صاحب بڑی نستعلیق شخصیت تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ظاہری ٹھاٹ باٹ ملحوظ رکھتے تھے بلکہ اس سے مراد مزاج کی نفاست اور لطافت تھی جو ان کی گفتگو، ان کی نشست و برخاست، ان کے لباس اور ان کی خوراک ہر چیز سے ظاہر تھی۔ بعض لوگ اپنے علمی مشاغل میں ایسے منہمک ہوتے ہیں کہ انھیں اپنے سر و پا کی فکر یا احساس نہیں رہتا یا پھر بعض لوگ جو ہر قسم کے جوہر سے عاری ہوتے ہیں اپنے جذب کے اظہار کے لیے ایسا بہروپ اختیار کرتے ہیں۔ سو خان صاحب کے یہاں بہروپ کا تو خیر سوال کیا۔ وہ حقیقت میں بڑے پایہ کے عالم، نقاد، استاد اور طالب علم بہ یک وقت ہوتے ہوئے بھی شخصیت کی نفاست کو نظر انداز نہیں کرتے۔ پچھلے چند سالوں میں انھوں نے کئی مرتبہ کراچی یونیورسٹی کے کیمپس میں قیام کیا اور مجھے ان کی خدمت کے لیے کچھ لمحے ملے۔ ان میں میں نے ان کے لباس، ان کے اوقاتِ زندگی، ان کی خوراک اور گفتگو میں ایسی شائستگی دیکھی جس کی مثال دیکھنے کو اب نگاہیں ترستی ہیں۔ ان ... مجھے اپنی ساری زندگی رہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے ڈول، بے ہنگم اور بھونڈے پن کی مکمل مثال نظر آتی اور خاں صاحب مجھے اس دور، اس ملک اور اس ماحول سے الگ ایک ابدی روحانی لطافت اور جسمانی نفاست کی سرزمین کے مسافر لگنے لگتے۔ جس طرح میں نے کبھی ان کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں دیکھی اسی طرح ان کا لباس بھی شکن سے پاک ہوتا۔ بیشتر میں نے ان کو سوٹ میں ہی ملبوس دیکھا اور اس لباس میں مجھے وہ ایک PERFECT GENTLEMAN نظر آتے۔

وضعداری ہماری روایات میں تہذیبی شرافت کی علامت تھی اور حمید احمد خاں وضعدار آدمی تھے۔ ایک دو نہیں سیکڑوں چھوٹی بڑی باتیں مجھے یاد ہیں جن سے ان کی وضعداری کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں ان سے ہر اعتبار سے چھوٹا تھا۔ عمر میں، منصب اور حیثیت میں، شہرت میں اثر و رسوخ میں علم و ادب میں وہ مجھ سے بہت بڑے تھے لیکن ان کی محبت اور وضعداری یہ تھی کہ کراچی آتے تو اکثر احمد علی خاں اور ہاجرہ مسرور کے یہاں قیام کرنے کی بجائے مجھ پر کرم کرتے حالانکہ یونیورسٹی کیمپس شہر سے خاصا دور ہے اور اکثر زندگی کی معمولی آسائشوں کے حصول میں بھی دقت پیش آتی ہے لیکن خان صاحب کی وضعداری یہ تھی کہ چند گھنٹوں کے لئے بھی کراچی آتے تو اس معمول میں فرق نہ آتا۔

ایک مرتبہ وائس چانسلروں کی مجلسِ قائمہ کا ایک اجلاس کراچی میں ہوا۔ خان صاحب تین بجے لاہور سے کراچی پہنچے۔ ہوائی اڈہ پر یونیورسٹی کی بھیجی ہوئی گاڑی اور اس کے شوفر طاہر جی موجود تھے۔ خان صاحب نے فرمایا جلسہ مہینے ہے، سات بجے مجھے واپس جانا ہے، شاید جلسہ کے بعد لیث صاحب سے ملاقات کا موقعہ نہ ملے، چلو پہلے وہاں چلتے ہیں۔ چنانچہ تشریف لائے اور محبت سے گھر میں ایک ایک کا حال تفصیل سے پوچھا۔ ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ ہماری خوشیوں سے بڑوں کی طرح خوش ہوتے اور ہماری پریشانی یا تکلیف سے انھیں بالکل بڑے بھائیوں کی سی پریشانی ہوتی۔ چند سال پہلے میں نے لاہور میں اپنے مکان میں کچھ توسیع کرائی۔ اس میں ایک بڑا کمرہ اور اس کی کھلی چھت بھی تھی۔ ماڈل ٹاؤن تشریف لائے اور پوچھا اتنے لمبے برآمدے اور کھلی چھت کا کیا مقصد ہے۔ میں نے کہا کہ ریٹائر ہونے کے بعد اس کمرے کو LOUNGE بنوا کر استعمال کریں گے۔ اس میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتابوں کی الماریاں ہوں گی، قالین کا فرش ہوگا، صوفے ہوں گے، لکھنے پڑھنے کی میز ہوگی اور اسے AIRCONDITION کریں گے۔ اس کی چھت پر باغِ معلق بنائیں گے۔ یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے کہ جی خوش ہوگیا اور اس وقت ان کا چہرہ حقیقی مسرت کے جذبات سے دمک اٹھا۔ میں سوچتا تھا کہ جب کراچی کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر لاہور آؤں گا تو یہ سب کچھ کروں گا اور لاہور میں اپنے بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کی الفت اور خلوص میں لکھنے پڑھنے کا مشغلہ جاری رکھوں گا۔ افسوس کہ خان صاحب کی وفات سے وہ خواب ادھورا رہ گیا۔

خان صاحب انگریزی کے استاد تھے اور میں نے ہمیشہ انھیں سوٹ پہنے ہی دیکھا۔ اس معاملہ میں بھی ان کی وضعداری کا وہی حال تھا۔ رسمی موقعوں پر چاہے موسم کتنا ہی گرم ہو اور سوٹ اور ٹائی، موزے اور بوٹ چھوڑ کر کُرتہ پاجامہ یا زیادہ سے زیادہ پتلون اور شرٹ پر اکتفا کرنے کو جی چاہتا ہو، خان صاحب کا اپنا لباس وہی رہتا۔ اس وضعداری کو کم لوگ اس حد تک نباہ سکتے ہیں۔ مجھے اپنا ہی ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ۱۹۵۶ میں میں لاہور سے کراچی آیا۔ موسم خاصا گرم تھا اور میں نے پہلی مرتبہ سوٹ اور شیروانی ترک کر کے پتلون اور بش شرٹ پہنی۔ اس ہیئت میں میں صدر میں اپنے رفیقِ کار ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب کے ساتھ کھڑا تھا کہ ایک صاحب قریب سے گزرے۔ قیوم صاحب سے علیک سلیک ہوئی اور دو چار باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ مجھے صورت کچھ آشنا نظر آئی، ان کے جانے کے بعد میں نے قیوم صاحب سے پوچھا کہ یہ کون صاحب تھے؟ قیوم صاحب کہنے لگے یہ زبیری صاحب ہیں۔ یونیورسٹی میں نفسیات کے استاد ہیں۔ پھر مجھے یاد آیا کہ یہ علی گڑھ میں میرے شاگرد رہ چکے تھے۔ بڑی حیرت ہوئی کہ انھوں نے مجھے نہ پہچانا اور نہ رسمی دعا سلام کی تکلیف کی۔ میں نے قیوم صاحب سے کہا کہ بھئی یہ تو علی گڑھ میں میرے شاگرد رہ چکے ہیں۔ تعجب ہے انھوں نے پہچانا بھی نہیں۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ قیوم صاحب نے زبیری صاحب سے شاید اس واقعہ کا ذکر کیا۔ وہ اسی دن بھاگے ہوئے میرے پاس آئے اور بڑی معذرت کی اور کہنے لگے میرے ذہن میں لیسٹ صاحب کے ساتھ پتلون اور بش شرٹ کا تصوّر ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہو سکتا تھا۔ علی گڑھ کی شیروانی جس میں کالر تک بٹن بند، بوٹ اور موزہ پیر میں، یا پھر پورا سوٹ، بس اس لباس سے ذہن نے دھوکا کھایا۔ میں بہت ہنسا اور کہنے لگا، وضعداری قائم رکھنے والوں پہ پاکستان میں میں نے بہت سے لطیفے اور نئے القاب اور خطابات سُنے ہیں، "بھائی جیسا دیس ویسا بھیس"۔

تو حمید احمد خاں صاحب کی وضعداری کا عالم یہ تھا کہ وہ سیاسی موسم کے ساتھ بدلتی نہیں تھی۔ ان میں بڑی شائستگی اور لچک تھی لیکن اپنے نظریات پر وہ نہایت سختی سے قائم تھے اور کسی قسم کی مصلحت سے اس میں فرق یا کمزوری گوارا نہیں کرتے تھے۔ افسوس کہ ہمارے زمانہ میں اس وصف کی کوئی قدر نہیں کی جاتی بلکہ

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

کی تلقین کی جاتی ہے۔ حمید احمد خاں صاحب نے اپنی اس خوبی یا خرابی کی بدولت بہت تکلیف اٹھائی اور انھیں بڑا دکھ ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی کے میں نے بہت سے وائس چانسلر دیکھے اور کم و بیش آٹھ سال تک میں اس یونیورسٹی سے وابستہ رہا۔ ان وائس چانسلروں میں بڑے عالم فاضل بھی دیکھے، بڑے منتظم بھی، لیکن خان صاحب اپنی مثال آپ تھے۔ میں صرف ایک واقعہ بیان کروں گا۔ برعظیم پاک و ہند کی ادبی تاریخ کا منصوبہ بنا تو اس کے لیے ایک کمیٹی بنی جو پوری تاریخ کا تفصیلی خاکہ بنانے پر مامور ہوئی۔ اس میں خان صاحب نے لاہور اور بیرونِ لاہور سے ماہرین کو بلایا۔ جلسہ روز صبح نو بجے شروع ہوتا اور شام کو چھ یا سات بجے تک مسلسل جاری رہتا۔ سنڈیکیٹ روم سے ملحق کمرے میں سب لوگ جمع ہو جاتے، دوپہر کا کھانا وہیں کھا لیتے اور وہیں فرش پہ دراز ہو کر سب لوگ ذرا کمر سیدھی کر لیتے۔ ممبروں میں دو حقّہ پینے والے بھی تھے یعنی مولانا غلام رسول مہر مرحوم اور میں، چنانچہ میں گھر سے حقہ لے آتا اور دن بھر کام کے ساتھ حقہ کا دَور بھی چلتا رہتا، اور خان صاحب پوری مستعدی سے شروع سے آخر تک ان مجلسوں میں شریک رہتے اور یہ سلسلہ کوئی دس بارہ دن تک چلتا رہا۔ بہرحال تاریخ کا منصوبہ بنا۔ اس پر کام شروع ہوا۔ اس کی دشواریوں کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو اس قسم کے کاموں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واسطہ پڑتا ہے۔ خان صاحب کی ذاتی توجہ اور کوشش سے اس منصوبہ کا بڑا حصہ شائع ہو چکا ہے۔ ممکن ہے بعض اجزا میں کچھ کمزوری بھی رہ گئی ہو لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ ایسا کام ہے جو قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کی کسی اور یونیورسٹی میں انجام نہ پا سکا۔ حمید احمد خان صاحب نے ڈاکٹر لائٹنر، ڈاکٹر وولنر اور ان اکابر کی روایت کو زندہ کیا اور آگے بڑھایا جن سے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کو بین الاقوامی سطح پر علمی اعتراف نصیب ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ ایسے شخص کو ایک سرکاری ملازم کے غصہ کا شکار ہو کر اس عہدہ سے الگ ہونا پڑا۔ ان کے احباب کو علم ہے کہ خان صاحب کو اس کا کتنا ملال تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ جاہ و منصب کے خواہاں تھے بلکہ اس وجہ سے کہ انھوں نے دیکھا کہ نوکر شاہی، علم، مراکزِ علم اور علما پر کس درجہ حاوی ہے۔ ہمارے ملک کی علمی پستی اور زوال کی بڑی ذمہ داری اسی نوکر شاہی پر عائد ہوتی ہے۔ یہ بات میرے ذاتی علم میں ہے کہ تحقیق و تفتیش کے نہایت ضروری اور مفید منصوبے جن کے مرتب کرنے والے وہ حضرات ہوتے ہیں جو تیس تیس اور چالیس چالیس سال اپنی عمر کے اسی میدان میں تحقیق میں صرف کر چکے ہیں، ان کے منصوبوں پر عمل درآمد کی منظوری یا نامنظوری ان لوگوں کے اختیار میں ہوتی ہے جن کو تحقیق یا ریسرچ کے سر یا پیر کا بھی علم نہیں ہوتا۔ جب تک ہمارے ملک میں یہ روش قائم رہے گی، علم اور اہلِ علم اس کا شکار ہوتے رہیں گے اور علمی اور سائنسی دنیا میں ہماری کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔

خان صاحب اردو کے عاشق تھے اور اس معاملہ میں بھی وہ مصلحت یا سمجھوتہ کے قائل نہ تھے۔ وہ اس سلسلے کی ایک کڑی تھے جس میں سر عبدالقادر، مولانا ظفر علی خان، میاں بشیر احمد، مولانا صلاح الدین، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک جیسے اردو کے عاشق نظر آتے ہیں، اور اردو سے ان کی یہ وابستگی بھی نظریاتی اور فکری تھی، محض جذباتی نہ تھی۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی، مرکزی ترقیِ اردو بورڈ لاہور اور مجلسِ ترقیِ ادب میں اپنے دَور میں اردو کے لیے بہت کچھ کیا اور جو نہ کر سکے وہ محض مداخلت کی وجہ سے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ موقع ان داستانوں کا نہیں، میرے سامنے تو وہ حمید احمد خاں ہیں جو انگریزی کے استاد ہونے کے ساتھ اردو کے نقاد اور سخن فہم و سخن شناس بھی تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اب سے کوئی چالیس سال پہلے میں نے کسی مضمون میں حمید احمد خاں صاحب کا غالبؔ کے بارے میں یہ فقرہ پڑھا تھا کہ غالب اپنے کلام اردو میں بھی اپنا سلسلہ ولیؔ اور میرؔ کی بجائے عرفیؔ شیرازی، صائبؔ، کلیمؔ اور بیدلؔ سے ملاتے ہیں۔ یہ فقرہ آج تک غالبؔ کے باب میں میرے مطالعے کے ذہنی پس منظر میں ہے اور شاید میں نے اسے بار بار لکھا بھی ہے۔ حمید احمد خاں صاحب ہمارے غالب شناسوں میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا ایک تازہ کارنامہ نسخۂ حمیدیہ کی تدوین و ترتیبِ نو ہے جو مرزا کی صد سالہ برسی کی یادگار مطبوعات میں شامل ہے۔

خاں صاحب بہت کچھ کرنا چاہتے تھے، انھوں نے بہت کچھ کیا اور بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن افسوس کہ اجل نے ان کو مہلت نہ دی۔ مجھے یقین ہے کہ بہ زبانِ اقبال "چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست" خاں صاحب کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ ضرور ہوگی جو مردِ مومن کے ایمان اور اعتقاد کی نشانی ہے۔

انتخاب حدیث

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

یہ کتاب ان منتخب احادیث کا مجموعہ ہے جو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تعلق رکھتی ہیں اور جن سے فقہ کی تشکیلِ جدید میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ ہر حدیث کی الگ سرخی قائم کی گئی ہے اور اس کا سلیس ترجمہ بھی درج ہے۔ یہ مجموعہ حدیث کی چودہ کتابوں کا خلاصہ ہے اور بے مثل انتخاب ہے۔ قیمت ۲۵ روپے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com